تحریر : علامہ محمد اسد
ترجمہ : محمد معین خان بی۔ اے (عثمانیہ)

اسلامی اور مغربی

تہذیب کا بنیادی فرق

علامہ محمد اسد کی کتاب کی مزید اور آخری قسط پیش خدمت ہے۔ یہ کتاب کے دوسرے باب THE SPIRIT OF THE WEST کا ترجمہ ہے۔ پہلے باب کی طرح اس باب میں بھی مصنف نے کہیں بڑی ادق اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ مضمون اگرچہ خاصا طویل ہے لیکن بہت ہی سیر حاصل ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے سبق آموز ہے۔ جو اپنی مرعوب ذہنیت کے زیر اثر اپنی مشکلات کا حل مغربی تہذیب میں تلاش کرنے پر مصر ہیں۔ مغربی تہذیب ایک خبیث روح ہے جس سے چمٹ جاتی ہے اس کا ستیاناس کر دیتی ہے اس کی سب سے پہلی اور سب سے کاری ضرب نظریۂ حیات (IDEALOGY) پر پڑتی ہے اور نظریۂ حیات کی تباہی سے قوموں کا جو حشر ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔ ——— محمد معین خان ———

★

گذشتہ باب میں اسلام کی اخلاقی بنیادوں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے کی سعی کی گئی تھی۔ اس سے ہمیں یہ آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی تہذیب حکومت الٰہیہ (THEOCRACY) کی ایک ایسی مکمل ترین صورت ہے کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہاں مذہبی لحاظ ہر شے میں مضمر اور ہر چیز سے بالا ہے۔ اس تہذیب کا اگر مغربی تہذیب کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان دونوں کے نظریات میں فرق و اختلاف کی ایک وسیع خلیج نظر آئے گی۔

جدید مغرب کی سرگرمیاں اور کوششیں صرف عملی افادہ اور حرکت انگیز پھیلاؤ (DYNAMIC EXPENSION)

کے ملحوظات کے تابع ہوتی ہیں۔ زندگی سے اسکی اپنی اخلاقی صداقت (MORAL REALITY) منسوب کئے بغیر اسکی امکانی قوتوں کو دریافت کرنا اور ان قوتوں کے تجربے کرنا اس تہذیب کا اصل مدعا ہے۔ عرصہ ہوا کہ جدید یورپی یا امریکی کے نزدیک زندگی کے معنی و مقصد کے سوال کی قطعاً کوئی عملی اہمیت نہیں رہی۔ اگر اہمیت ہے تو صرف اس سوال کی کہ زندگی کون کون سی شکلیں اختیار کرسکتی ہے؟ کیا نسلِ انسانی فطرت کی مکمل تسخیر کی جانب بڑھ رہی ہے؟ مابعد الذکر سوال کے بارہ میں جدید مغربی کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ لہٰذا وہ اس بارہ میں اسلام سے متفق نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں آدم اور اولادِ آدم کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً

اس کا بدیہی مفہوم یہی ہے کہ انسان کو زمین پر حکومت اور ترقی کرنے کے لئے مامور کیا گیا ہے لیکن انسانی ترقی کی نوعیت کیا ہونی چاہئے، اس کے متعلق اسلامی اور مغربی نقاطِ نظر میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔

جدید مغرب اس بات کا قائل ہے کہ نوعِ انسانی عملی حاصلات (PRACTICAL ACHIEVEMENTS) اور سائنٹیفی فروغ کے ذریعہ ایک ارتقاء پذیر روحانی اصلاح و ترقی سے شادکام ہوسکتی ہے۔ اور اسلام مغرب کے اس مادہ پرستانہ حرکت انگیز تصورِ انسانیت ——————— (METERIALISTICALLY — DYNAMIC CONCEPTION OF HUMANITY) کا یکسر مخالف ہے اسلام ذاتِ مجموعی یعنی نوعِ انسانی کے روحانی ممکنات کو ایک سکونی کمیت (STATIC QUANTITY) قرار دیتا ہے۔ مغرب کے پاس یہ بات مسلمہ ہے کہ فطرتِ انسانی ایک تدریجی تغیر و ترقی کے عمل سے ایسی ہی گذر رہی ہے، جیسے ایک پودا پروان چڑھتا ہے۔ لیکن اسلام نے اس بات کو کبھی قبول ہی نہیں کیا۔ اس لئے کہ فطرت مذکور یعنی روحِ انسانی کسی حیاتیاتی کمیت پر مؤسس نہیں ہے۔ فلسفۂ یورپ مادی علم و آسائش کی ترقی اور روحانی و اخلاقی ارتقاء کو ایک جیسا قرار دینے میں جس بنیادی غلطی کا مرتکب ہوا ہے اس کا سبب ایک ایسی ہی بنیادی غلطی ہے جو اس فلسفہ سے حیاتیاتی ضابطوں کو غیر حیاتیاتی حقائق پر منطبق کرنے کے معاملہ میں سرزد ہوئی ہے۔ اس تصور کی تہہ میں وجودِ روح سے جدید مغرب کا انکار مضمر ہے۔ اسلام جو مادرائی تصورات پر مبنی ہے۔ روح کو ایک ایسی حقیقت سمجھتا ہے جو ریب و شک یا قیل و قال سے بالا ہے۔ مادی ترقی اور روحانی ترقی اگرچہ ایک دوسرے کی مخالف تو نہیں ہیں لیکن وہ ایک جیسی

بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ دونوں حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا ایک دوسرے پر انحصار کرنا بھی لازمی نہیں ہے۔ دونوں ایک ساتھ فروغ تو پا سکتی ہیں۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔

اسلام جہاں نوعِ انسانی بہ حیثیت ہیئت اجتماعی کی خارجی یعنی مادی ترقی کے امکان کو واضح طور پر تسلیم کرتا ہے بلکہ شد و مد کے ساتھ اس کا اعلان بھی کرتا ہے، وہاں وہ اس امکان کا صاف صاف لفظوں میں انکار کرتا ہے کہ نوعِ انسانی اپنی مجموعی حاصلات ——— (COLLECTIVE ACHIEVEMENTS) کے ذریعہ کسی روحانی ترقی سے بہ حیثیت المجموع ہم کنار ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روحانی ترقی کا حرکت انگیز عنصر صرف فرد کی ذات تک محدود ہوتا ہے لہٰذا ہمارا ایک ہیئتِ اجتماعی کی صورت میں کاملیت (PERFECTION) کی جانب قدم بڑھانا قطعاً ناممکن ہے۔ بریں بنا ہم میں سے ہر ایک کو اپنے روحانی مقصود کے حصول کے لئے ایک فرد کی حیثیت سے کوشش کرنا ہوگی۔ ہر ایک کو خود ہی اس کوشش کی ابتدا بھی کرنا ہوگی اور خود ہی اسے اتمام تک پہنچانا بھی ہوگا۔

انسان کے روحانی مقدرات کے بارہ میں اس صریحی انفرادیت پسندانہ نظریہ کو معہ اور معاشرتی اشتراک کے اسلامی تصوّر کے ذریعہ متوازن بنا دیا گیا ہے۔ اس تصوّر کی روح سے معاشرہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی خارجی زندگی کو کچھ اس انداز سے ترتیب دے کہ ہر فرد کو اس کی اپنی روحانی مساعی میں کم سے کم مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑے اور زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی میسّر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامی حیاتِ انسانی کے روحانی پہلو سے بھی اتنا ہی تعلق رکھتی ہے جتنا کہ اس کے مادی پہلو سے۔ نیز یہ شریعت زندگی کے انفرادی اور معاشرتی دونوں پہلوؤں کو بھی محیط ہے۔

اس قسم کا تصور صرف روحِ انسانی کے وجود اور نتیجۃً حیاتِ انسانی کے ماورائی مقصد کے بارہ میں ایجابی یقین کی بنیاد پر ہی تشکیل پا سکتا ہے۔ لیکن جدید مغربی جو وجودِ روح کا پوری طرح قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک مقصدِ حیات کی قطعاً کوئی عملی اہمیت نہیں ہے۔ تمام ماورائی قیاسات اور ملحوظات (TRANSCENDENTAL SPECULATION AND CONSIDERATION) کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

جس چیز کو ہم مذہبی رویہ (RELIGIOUS ATTITUDE) کہتے ہیں وہ ہمیشہ اس یقین پر مبنی

ہوتا ہے کہ دنیا میں اخلاق کا ایک ہمہ گیر ماورائی قانون موجود ہے اور اس قانون کی اطاعت نوعِ بشر کو لازم ہے۔ لیکن جدید مغربی تہذیب معاشی، معاشرتی یا قومی تقاضوں کے سوا کسی اور چیز کے آگے انسان کے سرِ اطاعت خم کرنے کی ضرورت تسلیم نہیں کرتی — اس تہذیب کا حقیقی معبود روحانی نہیں بلکہ مادّی ہے اور وہ ہے آسائشِ حیات۔ اس کا اصل فلسفہ عزم للقوۃ برائے قوت (WILL TO POWER FOR POWER) میں مظہر ہے۔ یہ دونوں چیزیں اسے قدیم رومی تہذیب سے ورثہ میں ملی ہیں۔

یہاں رومی تہذیب کا جو اس انداز میں ذکر کیا گیا ہے کہ جدید مغرب کی مادہ پرستی کی یہی ذمہ دار ہے۔ شائد ان لوگوں کو کچھ عجیب سا لگے جو قدیم اسلامی شہنشاہیت کے ساتھ رومی شہنشاہیّت کی مماثلت کے تذکرے بار بار سنتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ماضی میں رومی شہنشاہیّت اور اسلامی شہنشاہیّت کے سیاسی نظام ہم رشتہ تھے تو اسلام اور مغرب جدید کے بنیادی تصورات کے مابین اس قدر صریح تفاوت و اختلاف کیوں ہے؟ جواب بالکل سیدھا سادا ہے۔ ان دونوں شہنشاہتوں کے مابین فی الحقیقت کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔ رہ گئی وہ مشہور عام مماثلت جس کے آئے دن تذکرے ہوتے رہتے ہیں، سو وہ ایسی فرسودہ اور ساقط الاعتبار تاریخی روایتوں پر مبنی ہے جن کے ذریعہ موجودہ نسلوں کے ذہنوں کو سطحی اور ادھوری معلومات بہم پہنچائی جارہی ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسلامی اور رومی شہنشاہتوں کے درمیان قطعاً کوئی چیز مشترک نہ تھی بجز اس حقیقت کے کہ یہ دونوں شہنشاہتیں وسیع و عریض سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھیں اور مختلف قومیں ان کے زیرنگیں تھیں۔ جب تک یہ شہنشاہتیں منصۂ شہود پر باقی رہیں۔ ایسی محرک قوتیں (MOTIVE FORCES) ان کی رہنمائی کرتی رہیں جو ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھیں اور ان سے تاریخ کے بالکلیہ متضاد مقاصد پورے کراتی رہیں۔ مزید براں اگر شکلیاتی (MORPHOLOGICAL) زاویۂ نگاہ سے ان دونوں شہنشاہتوں کا جائزہ لیا جائے تو بھی ہمیں ان کے درمیان وسیع فرق نظر آئے گا۔ رومی شہنشاہیت کو اپنے انتہائی جغرافیائی حدود تک پھیلنے اور سیاسی بلوغ کو پہنچنے کے لئے تقریباً ایک ہزار سال لگے۔ درآنحالیکہ اسلامی شہنشاہیت کا پودا تقریباً اسی سال کی مختصر سی مدّت کے اندر ہی اندر زمینِ وجود سے اگا اور پوری بہار کو پہنچ گیا۔ جہاں تک ان شہنشاہتوں کے زوال کا تعلق ہے۔ اس میں ان کا باہمی فرق اور بھی زیادہ واضح نظر آتا

ہے۔ رومی شہنشاہیت کا زوال صرف ایک صدی کے اندر ہی اندر اپنے تمام مدارج طے کر گیا تھا۔ انجام کار ہنوں اور گاتھوں کی ترک وطنی نے اس شہنشاہیت کی قسمت پر ہمیشہ کے لیے مہر لگا دی۔ یہ زوال اس قدر مکمل ہوا کہ زمانہ نے اس شہنشاہیت کے ادبی اور تعمیراتی کارناموں کے سوا اور کسی نقش کو صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہنے دیا۔ بازنطینی شہنشاہیت عام طور سے رومی شہنشاہیت کی وارث قرار دی جاتی ہے۔ حالانکہ اس پر وارث ہونے کا اطلاق صرف انہی معنی میں ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے علاقوں پر اس کا پرچم اقتدار لہراتا تھا جو کسی زمانہ میں رومی شہنشاہیت کے زیر نگیں رہ چکے تھے ورنہ اس کے معاشرتی ڈھانچہ اور سیاسی نظام کو رومہ کی ہیئت سیاسیہ سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ دوسری طرف اسلامی شہنشاہیت جس صورت میں کہ وہ بیکر خلافت میں نظر آتی ہے، اگرچہ اپنے طویل دور حیات میں متعدد تنزلات اور خانوادی تبدلات سے دوچار ہوتی رہی۔ لیکن اس کا ڈھانچہ بنیادی طور پر ایک ہی سا رہا۔

جہاں تک بیرونی حملوں کا تعلق ہے، مغلوں کی تاخت و تاراج بھی —— یہ اس سے بھی زیادہ شدید تھی جو رومی شہنشاہیت کو ہنوں اور گاتھوں کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑی تھی —— مسلمانوں کے معاشرتی نظام اور سلطنت خلفاء کے سیاسی وجود کی سالمیت کو متزلزل نہ کر سکی۔ گو کہ ازمنۂ مابعد میں سلطنت اسلامیہ کے معاشی جمود اور ذہنی تعطل میں اس تاخت و تاراج کے اثر کا بڑا حصہ رہا۔ اس ایک صدی کے مقابلہ میں جو رومی سلطنت کو منہدم و برباد کرنے کے لئے درکار ہوئی تھی، خلفاء کی اسلامی سلطنت کی تباہی کے لئے ایک ہزار سال درکار ہوئے تاآنکہ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کی صورت میں اس شہنشاہیت کا سیاسی زوال ایک حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آگیا۔ اس کے ساتھ ہی معاشرتی انتشار کے ایسے ایسے نقوش ابھرنے شروع ہوئے جنہیں آج بھی ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔

ان تمام واقعات کو دیکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نوع انسانی آج تک جتنے بھی معاشرتی [illegible] تجربے کر چکی ہے، اسلام کا معاشرتی نظام کیا بلحاظ باطنی طاقت کے اور کیا بلحاظ سماجی صحت کے ان سب سے بدرجہا ارفع و اعلیٰ تھا۔ حتیٰ کہ چینی تہذیب جو صدیوں تک دفاع و مقاومت کی ایسی ہی قوتوں کا مظاہرہ کرتی رہی ہے، وہ بھی اس قابل نہیں ہے کہ یہاں مماثلت کے طور پر پیش کی جا سکے۔ چین ایک برّاعظم کے آخری کنارہ پر

واقع ہے اور نصف صدی قبل تک ـــــ یعنی جدید جاپان کے عروج تک ـــــ وہ ہر حریف طاقت کی رسائی سے دور ہی رہا۔ چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کے عہد میں مغلوں کے ساتھ چینیوں کی جو لڑائیاں ہوئی ہیں وہ چینی شہنشاہیت کے حاشیوں سے آگے بڑھنے نہیں پائی تھیں۔ لیکن اس کے برعکس اسلامی شہنشاہیت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور ہر زمانہ میں قوی اور شہ زور دشمنوں سے گھری رہی۔

مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کا علاقہ طلوعِ صبح تاریخ ہی سے متحارب نسلوں اور ثقافتی توانائیوں کا شعلہ زار مرکز بنا رہا۔ لیکن اسلام کے معاشرتی نظام نے اپنے مخالف عناصر کے مقابلہ میں جو مقاومت پیش کی اسے کبھی یا کم از کم حال حال تک زیر نہیں کیا جا سکا۔ تاریخ کے اس حیرت انگیز منظر کی تشریح کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ دراصل قرآن پاک کی تعلیم تھی جس نے اسلامی معاشرہ کو ٹھوس بنیاد عطا کی تھی۔ اور یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ زندگی تھا جو اس عظیم الشان معاشرتی نظام کے اطراف ایک فولادی حصار بنا رہا۔ لیکن رومی شہنشاہیت کو ایسا کوئی روحانی عنصر نصیب نہ ہوا تھا جو اسکی سالمیت کی حفاظت کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شہنشاہیت اس قدر تیزی کے ساتھ پارہ پارہ ہو گئی۔

اسلامی اور رومی شہنشاہتوں میں ایک فرق اور بھی تھا۔ اسلامی شہنشاہیت کے کے اندر کسی استحقاقی قوم یا گروہ کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ اور حکومت و اقتدار ایک ایسے تصور کی تبلیغ و اشاعت کے تابع کر دئے گئے تھے۔ جسے اس کے علم بردار مذہب کی رفیع الشان سچائی گردانتے تھے۔ اس کے برخلاف جو تصور رومی شہنشاہیت کی رگ و پے میں جاری و ساری تھا وہ تسخیر قوت اور صرف مادرِ وطن کے مفاد کی خاطر دوسری اقوام سے استحصال ناجائز کا تصور تھا۔ رومی شہنشاہیت میں ایک استحقاقی گروہ تھا، جس کے لئے بہتر سے بہتر آسائشِ حیات فراہم کرنے کی خاطر رومیوں کے نزدیک ہر تشدد جائز اور ہر ناانصافی روا تھی۔ مشہور زمانہ "رومن انصاف" صرف رومیوں کے حق میں انصاف تھا۔ یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ اس قسم کا رویہ تو زندگی اور تہذیب کے ایک بالکلیہ مادہ پرستانہ تصور کی بنیاد پر متشکل ہو سکتا تھا ـــــ ایسی مادہ پرستی جسے ذوقِ تعقل نے نفاست و شائستگی تو بخش دی تھی لیکن وہ تمام روحانی قدروں سے بے گانہ تھی۔ اہلِ رومہ مذہب

سے کبھی آشنا ہی نہ ہوئے تھے۔ ان کے روائتی دیوتا یونانی دیوتاؤں کے مٹے مٹے سے چربے تھے ـــــ نحیف و ناتواں بھوت پریت جنہیں معاشرتی ریت رسم کے مفاد کی خاطر بلاچوں وچرا تسلیم کرلیا گیا تھا۔ ان دیوتاؤں کو "حقیقی" زندگی میں کسی قسم کی مداخلت کی کوئی اجازت ہی نہ تھی۔ جب کبھی ان سے کوئی حاجت طلب کی جاتی تو وہ حاجت مندوں کو اپنے پروہتوں کی وساطت سے مبہم قسم کے جوابات دیدیا کرتے تھے۔ ان کے بارہ میں کبھی یہ سوچا ہی نہیں گیا کہ یہ انسانوں کو کوئی ضابطۂ اخلاق بھی دے سکتے ہیں۔ یا ان کے اعمال کی رہنمائی کرسکتے ہیں

یہ تھی وہ زمین جس سے جدید مغربی تہذیب کا پودا اگا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تہذیب نے اپنے دورانِ فروغ میں دوسرے کئی اثرات بھی قبول کئے ہیں۔ اور قدرتی طور پر رومہ کے ثقافتی ورثہ کے متعدد پہلوؤں میں تبدیلیاں اور ترمیمیں بھی کی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ آج مغربی اخلاقیات اور نظریۂ حیات میں جو بھی چیز حقیقی نظر آتی ہے۔ اس کا سلسلہ براہِ راست رومی تہذیب سے جاملتا ہے۔ چونکہ قدیم رومہ کی ذہنی اور معاشرتی فضا بالکلیہ افادیت پسندانہ اور مذہب دشمن تھی ـــــ علی الظاہر نہ سہی فی الحقیقت ضرور ـــــ اس لئے مغربِ جدید کی فضا بھی اسی رنگ سے رنگین ہے۔ ماورائی مذہب کے خلاف کوئی ثبوت فراہم کئے بغیر اور اس ثبوت کی ضرورت کو تسلیم کئے بغیر جدید مغربی فلسفہ ماورائی اخلاقیات کو بالعموم عملی غور و تامل کی حدوں کے پرے چھوڑ دیتا ہے۔ گو کہ یہ فلسفہ مذہب کے ساتھ رواداری بھی برتتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس پر ایک معاشرتی ریت رسم کی حیثیت سے زور بھی دیدیا کرتا ہے۔ مغربی تہذیب اگرچہ شدت کے ساتھ خدا کا انکار تو نہیں کرتی لیکن اس کے موجودہ ذہنی نظام میں خدا کا نہ تو کوئی مقام ہے اور نہ اس نام کے استعمال کی کوئی گنجائش ہی ہے۔ اس تہذیب نے انسان کی ایک ذہنی دشواری ـــــ کلیت حیات (TOTALITY OF LIFE) کو ادراک کرنے کی عدم استطاعت ـــــ کو نیکی کا رنگ دیدیا ہے۔ پس جدید مغرب صرف انہی تصوّرات کو عملی اہمیت دیتا نظر آتا ہے جو تجربی علوم کے دائرے میں آتے ہیں یا کم از کم جو انسان کے معاشرتی تعلقات پر محسوس طریقہ سے اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ چونکہ وجودِ باری تعالیٰ کا مسئلہ ان ہر دو زمروں سے بادی النظر میں کوئی تعلق نہیں رکھتا اس لئے مغربی ذہن خدا کو اصولاً عملی

غور و تامل کی اقلیم سے خارج کرنے پر مائل ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا رویہ مسیحی طریق فکر کے مطابق کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا مسیحیت — جو مغربی تہذیب کا روحانی سرچشمہ سمجھی جاتی ہے — ماورائی اخلاقیات پر مبنی دین نہیں ہے؟ یقیناً مسیحیت ایک ایسا ہی دین ہے۔ لیکن مغربی تہذیب کو مسیحیت کا ثمرہ سمجھ لینا بڑی فاش غلطی ہوگی۔ مغرب جدید کی ذہنی بنیادیں آپ کو روما سے قدیم کے اس تصور میں ملیں گی کہ زندگی ایک خالص افادیت پسندانہ قضیہ (UTILITARIAN PROPOSITION) ہے جس کا کوئی ماورائی پیش نظر (OUT LOOK) نہیں ہے۔ رومہ کے اس تصور حیات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ "چونکہ حیات انسانی کی ابتداء اور جسمانی موت کے بعد اس حیات کے مقدرات کے بارہ میں ہم — سائنسی تجربات اور قیاسات کے ذریعہ — حتمی طور پر کچھ نہیں جانتے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی تمام تر توانائیوں کو اپنے مادی اور ذہنی ممکنات کے فروغ و ترقی پر مرکوز کر دیں اور ماورائی اخلاقیات اور اخلاق کے ان مسلمہ اصولوں کو جو معروضات پر مبنی ہیں اور سائنسی ثبوت کو چیلنج کرتے ہیں۔ اپنی راہ میں حائل ہونے کا کوئی موقع نہ دیں۔"

بلاشبہ مغربی تہذیب کا یہ مخصوص انداز فکر مسیحیت کے لئے اتنا ہی ناقابل قبول ہے جتنا کہ خود اسلام یا کسی اور مذہب کے لئے۔ کیونکہ اسکی اصل ہی ملحدانہ ہے۔ لہٰذا جدید مغربی تہذیب کے عملی کارناموں کو مسیحی اثر سے منسوب کرنا انتہائی جہل اور مضحکہ خیز بات ہوگی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس عظیم سائنسی اور مادی فروغ میں جس کی بدولت مغرب کی موجودہ تہذیب تمام تہذیبوں کے مقابلہ میں فائق و سربلند نظر آ رہی ہے۔ مسیحیت نے جو حصہ ادا کیا ہے وہ نہایت ہی معمولی اور حقیر سا تھا۔ مغرب کے تمام علمی و عملی کارنامے درحقیقت اس ذہنی جنگ کے نتیجے ہیں جو یورپ مسیحی کلیسا اور اس کے نظریہ حیات کے خلاف قرن ہا قرن تک لڑتا رہا۔

صدیوں تک روح یورپ ایک ایسے مذہبی نظام کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی رہی جس کے تار و پود میں تحقیر فطرت کا عنصر شامل تھا۔ ترک دنیا یا رہبانیت کی تلقین جس کے سروں سے اناجیل کی ساری فضا گونج رہی ہے، ظلم و زیادتی کے آگے چپ چاپ سرنگوں ہو جانے کا مطالبہ، جنس سے کراہت (گویا یہ بھی کوئی ایسی چیز ہے جسکی بنیاد اس معصیت

پر قائم ہے جس کے آدم و حوا جنت میں مرتکب ہوئے تھے۔ ازلی گناہ اور تصلیب مسیح کے ذریعہ اس گناہ کا کفارہ ——— یہ ساری باتیں حیاتِ انسانی کی ایسی تعبیر کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ گویا وہ کوئی ایسا ہی منزل نہیں بلکہ قریب قریب ایک ناگزیر برائی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کا عقیدہ دنیاوی معلومات کے حصول اور دنیاوی زندگی کے احوال کی اصلاح و ترقی کی سرگرم کوششوں کی حمایت نہیں کرتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ وجود انسانی کے بارہ میں اس ناپاک تصور نے عقلِ یورپ کو زمانہ دراز تک اپنا مطیع و منقاد بنائے رکھا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے دوران جبکہ اس سرے سے اس سرے تک مسیحی کلیسا کی مطلق العنانیت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ سائنسی تحقیقات کی اقلیم میں یورپ کا نہ تو کوئی جاندار وجود ہی تھا۔ اور نہ کوئی مقام۔ حد یہ کہ یونان و روما کے وہ فلسفیانہ کارنامے جنہوں نے یوروپی ثقافت کو خلعتِ وجود عطا کیا تھا۔ ان سے بھی یورپ کا حقیقی رشتہ ناتہ ٹوٹ چکا تھا۔ عقلِ یورپ بار بار بغاوت کرتی رہی اور کلیسا نے ہر بار اس بغاوت کو کچل کر رکھ دیا۔ قرونِ وسطیٰ کی تاریخ عقلِ یورپ اور روحِ کلیسا کی خوں آشام آویزشوں کی داستان سے بھری پڑی ہے۔

یوروپی ذہن کو عقل کی ان بندشوں سے جو مسیحی کلیسا نے اس پر عائد کر رکھی تھیں۔ نشاۃِ ثانیہ کے زمانہ میں آزادی نصیب ہوئی تھی اور یہ آزادی بڑی حد تک ان نئے ثقافتی محرکات اور تصورات کی رہینِ منت تھی، جنہیں مسلمان عرب کئی صدیوں سے مغرب کو منتقل کرتے چلے آرہے تھے۔

یونانِ قدیم اور متاخر ھیلانیاتی (HELLINISTIC) ثقافت کی جو بھی چیز سب سے عمدہ نظر آئی عربوں نے اسے متقدم اسلامی شہنشاہیت کے قیام کے بعد کی صدیوں کے دوران نہ صرف اپنی آموزش میں جانِ تازہ سے نوازا بلکہ اسکو بیش بہا اضافوں سے آراستہ بھی کیا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اسلامی فلسفہ میں ھیلانیاتی فلسفہ کا انجذاب مسلمانوں کے حق میں سرتاسر مفید ثابت ہوا۔ لیکن نوشاۃ ھیلانیاتی ثقافت (REVIVED HELLINISTIC CULTURE) جہاں ایک طرف اسلامی الٰہیات و فقہ میں ارسطاطالیسی اور نوافلاطونی فلسفہ کو شامل کرکے مسلمانوں کے حق میں نزولِ آفات کا سبب بنی تو دوسری طرف وہ عربوں کی وساطت سے یورپ کے حق میں زبردست مہیج و محرک کا پارٹ ادا کرکے موجبِ برکات ثابت

ہوئی۔ قرونِ وسطیٰ نے یورپ کی پیدائش قوتوں کو تاراج کر رکھا تھا۔ علوم معطل ہو چکے تھے۔ توہمات کا سکہ رواں تھا۔ سماجی زندگی اس قدر پست و ناشائستہ تھی کہ آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسے وقت عالمِ اسلام کے ثقافتی اثر نے ـــــ ابتداءً مشرق میں صلیبی معرکوں اور مغرب میں مسلم اسپین کی شاندار جامعات کے ذریعہ اور بعدہٗ بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات کے توسط سے جو جینوا اور وینس کی جمہوریتوں نے قائم کئے تھے ـــــ یورپی تہذیب کے مقفل دروازوں پر ہتھوڑے برسانے شروع کر دئے۔ یورپی عالموں اور مفکروں کی چندھیائی ہوئی آنکھوں کے سامنے اب ایک نئی تہذیب جلوہ نما تھی، نفیس و پاکیزہ ترقی پذیر پُر شوق زندگی سے بھرپور، ثقافت کے ان خزینوں کی مایہ دار، جنہیں یورپ عرصۂ دراز قبل ضائع اور فراموش کر چکا تھا۔ عربوں نے جو کچھ کیا وہ یونانِ قدیم کے علوم کا محض احیاء ہی نہ تھا، بلکہ ان کا کارنامہ اس سے بھی کہیں زیادہ عظیم الشان تھا۔ عربوں نے خاص اپنی ایک بالکل ہی جدید سائنسی دنیا تخلیق کی اور فکر و تحقیق کی ایسی ایسی راہوں کو سنوارا، دنیا جن سے اس وقت تک محض لاعلم تھی۔ پھر انہوں نے علم و تحقیق کو یہ سرمایہ دنیائے یورپ کو مختلف راستوں سے منتقل کیا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس جدید سائنسی دور میں آج ہم رہ رہے ہیں اسکی رسم افتتاح مسیحی یورپ کے شہروں میں نہیں بلکہ دمشق، بغداد، قاہرہ، قرطبہ، نیشاپور اور سمرقند جیسے اسلامی مرکزوں میں ادا ہوئی تھی۔

اسلام کے ثقافتی اثر نے حیاتِ یورپ پر بڑے گہرے نقش بٹھائے۔ اسلامی تہذیب کی آمد سے آسمانِ مغرب پر عقل و خرد کی ایک نئی روشنی پھیل گئی۔ اس تہذیب نے یورپ کو ایک نئی زندگی بخشی اور ایک نئے جذبۂ ترقی سے سرشار کیا۔ یورپی مورخین اس دور کو قدرشناسانہ انداز میں "نشاۃ ثانیہ" کا جو نام دیتے ہیں اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ علوم ہی کا نہیں بلکہ خود یورپ کا احیاء تھا۔ (باقی آئندہ)

دیرینہ پیچیدہ جسمانی روحانی امراض کے خاص معالج
جمال شفاخانہ رجسٹرڈ
صدر بازار نوشہرہ
دہلی روڈ لاہور کینٹ

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم
دارالعلوم دیوبند

قرآن کریم سے گرویدگی

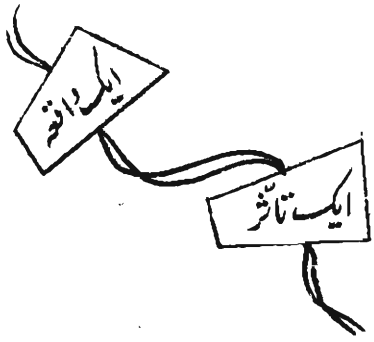

۱۳۶۷ھ میں میرے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم خاص دارالعلوم دیوبند نے وفات سے تقریباً پندرہ بیس دن قبل مجھے خلوت میں طلب فرمایا۔ حضرت مرحوم دارالمشورہ دارالعلوم دیوبند کے مشرقی برآمدے میں تشریف فرما تھے۔ جہاں آج میری نشست ہے۔ میں حسب الحکم حاضر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی غیر معمولی طور پر آبدیدہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ وفود گریہ کی وجہ سے چند منٹ تک بات بھی نہ کر سکے۔ مجھے پریشانی یہ ہوئی کہ کہیں مجھ سے تو ناگواری پیش نہیں آئی۔ اس لئے میں نے کلام میں ابتدا کرتے ہوئے عرض کیا کہ مجھ سے تو کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی جس کی وجہ سے یہ تاثر ہے۔ فرمایا: نہیں بلکہ مجھے یہ کہنا ہے کہ میرا وقت آگیا ہے اور بہت تھوڑا وقفہ باقی رہ گیا ہے۔ مجھے اس وقت یہ واقعہ سنانا ہے کہ جب میں قرآن کا حافظ ہو چکا تو حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ (حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) بے حد مسرور تھے اور اس ختم قرآن کی خوشی میں ایک زبردست ولیمہ کیا۔ ذبیحہ کرایا۔ عمائد شہر کو اور اعزاء واحباب کے ایک بڑے مجمعے کی لمبی چوڑی دعوت کی۔

یہ دن حضرت کے لئے یوم عید بنا ہوا تھا۔ چہرہ خوشی سے روشن تھا۔ اور غیر معمولی طور پر بشاش تھے۔ تقریب سے فارغ ہو کر مجھے خلوت میں طلب فرمایا۔ جس طرح میں نے تمہیں اس وقت بلایا ہے اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا میاں احمد خدا کا شکر ہے کہ تم حافظ ہو گئے۔ وقت آئے گا کہ تم عالم بھی ہو گے۔ تمہاری عزت بھی ہوگی، ملک میں تمہاری شہرت بھی ہوگی اور تمہیں دولت بھی میسر آئے گی۔ لیکن یہ سب چیزیں تمہارے لئے ہونگی۔ قرآن میں

نے تمہیں اپنے لئے یاد کروایا ہے۔ مجھے فراموش نہ کرنا۔ اور فرمایا: اور آج کا دن ہے یہ میرا دوامی عمل ہے۔ میں ہمیشہ دو پارے یومیہ حضرت قبلہ کو ایصالِ ثواب کی نیت سے پڑھتا ہوں۔ الحمدللہ آج تک ناغہ نہیں ہوا۔

یہ واقعہ سنا کر مجھ سے فرمایا، میاں طیّب الحمدللہ تم حافظ ہو چکے ہو، خدا کا شکر ہے کہ عالم بھی ہو چکے ہو۔ وقت آئے گا تمہاری عزّت بھی ہوگی، شہرت بھی ہوگی اور حق تعالیٰ تمہیں دولت بھی بہت کچھ عطا فرمائے گا۔ لیکن یہ سب کچھ تمہارے لئے ہوگا۔ یہ قرآن میں نے تمہیں اپنے لئے حفظ کرایا ہے مجھے فراموش نہ کرنا۔

میں اسی دن پہلے اسی وقت بلوچستان کے طویل سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ یہ واقعہ آٹھ بجے دن کا ہے اور میں دس بجے کی گاڑی سے بلوچستان روانہ ہوگیا۔ دل میں یہ بات جم چکی تھی اور اپنے قلب میں اس نصیحت اور وصیت پر عمل پیرا ہونے کا عزم باندھ لیا تھا۔ اسی سفر غالباً (کوئٹہ) میں اخبارات میں پڑھا کہ حضرت مرحوم حیدر آباد (دکن) کے سفر پر روانہ ہوگئے، جس کا میری روانگی کے وقت مجھے تو کیا حضرت مرحوم کو بھی تصور نہ تھا۔ اچانک ہی بمصالح دارالعلوم یہ سفر طے ہوا اور روانگی عمل میں آگئی۔

میں دس بارہ دن کے بعد دیوبند واپس ہوا تو اس وقت تک حضرت مرحوم کی واپسی نہ ہوئی تھی۔ چار چھ دن کے بعد تار سے اچانک وفات کی اطلاع ملی۔ مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ آنے والے مہینے کی پہلی تاریخ سے ہی میں نے حضرت مرحوم کی نصیحت بلکہ وصیّت کے مطابق مغرب کے بعد اوابین میں ایک پارہ یومیہ پڑھنے اور حضرت مرحوم کو ایصالِ ثواب کرنے کا معمول بنالیا۔ جو کہ الحمدللہ آج تک جاری ہے۔ اور خدا کرے دمِ آخر تک جاری رہے۔

حوادث و واقعات عبرت و موعظت کے لئے رکھے گئے ہیں۔ اس واقعہ سے جہاں موعظتِ حسنہ کی دولت ملتی ہے وہیں عبرت بھی ہم کنار ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس واقعہ سے نمایاں ہوتا ہے کہ ہر دو نامور بزرگ علماء آخرت میں سے تھے جنہوں نے اولاد کو قرآن کا پڑھنا پڑھانا عادتاً یا اسماءً یا منافع دنیا کی خاطر نہیں بلکہ آخرت کے لئے طے کیا تھا۔ ان کا مقصد اس قرآن سے اولاد کا متمول یا صاحبِ ثروت وجاہ بنانا نہ تھا بلکہ خود کو اولاد کو آخرت کے لئے تیار کرنا تھا، جو قرآن کے نازل ہونے کا حقیقی مقصد ہے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ ان حضرات کو قرآن کے ساتھ کس درجہ شغف اور تعلق